# خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش

یادش بخیر، خواجہ آتش کی عظمت میرے دل میں ایک عرصہ سے ہے اور ساتھ ہی اسکی خواہش بھی کہ اگر علاوہ ان متداول تذکروں کے کہیں سے انکے صحیح و مفصل حالات مل سکیں تو ان کو ترتیب دیکر پیش کروں۔ کیونکہ ایک تو آتش اور ناسخ کے زمانہ کے حالات زیادہ تر پردۂ خفا میں ہیں۔ چنانچہ ناسخ کے والد اور خاندان کا حال، ناسخ اور آتش کی پیدائش کا زمانہ، یہ اور ایسی ہی اکثر باتیں آج تک صحیح صحیح لوگوں کو نہ معلوم ہو سکیں۔ دوسرے عام تذکروں میں جو حالات خواجہ صاحب کے ملتے ہیں چونکہ ان کا ماخذ بیشتر بلکہ تمامتر۔ محمد حسین آزاد کا تذکرہ "آب حیات" ہے، اس لئے بجائے تسکین بخشنے کے اور زیادہ بے اطمینانی دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور خواجہ موصوف کے حالات کا ایک ایسا متضاد مجموعہ سامنے آتا ہے جس پر کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ گلِ رعنا اور آب بقا ضرور ظلماتِ ادبیات میں خضرِ راہ بنتے ہیں مگر پھر افسوس ہے کہ اُن کے مصنفوں کو ذرا پہلے کا زمانہ نہیں مل سکا اور مؤخر الذکر مبسوط نہیں!

میں نے اس تلاش میں مختلف تذکرے[۱] پڑھے بہت سی کتابیں دیکھیں اور بہت کچھ سرگردانی کے بعد ایک گونہ تسلی حاصل کر چکا تھا کہ مرزا جعفر علی خاں اثر کا مضمون بہ عنوان "خواجہ آتش" رسالہ زمانہ کی اکتوبر اور نومبر ۲۹ء کی اشاعتوں میں نکلا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ چلو مجھ سے زیادہ اہل شخص نے جو روشن خیال۔ سخن سنج اور تنقید کا علمبردار بھی ہے۔ جب اس مبحث پر قلم اُٹھایا ہے تو یقیناً تنگ نظری، جنبہ داری، تعارضِ حالات اور نادرستی روایات کو دور کرکے ایک عمدہ اور قابل ایراد و اضافہ چیز منظرِ عام پر لائے گا۔ میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ میں نے نہایت پُر شوق ہاتھوں سے اُسے لیا اور بیتاب نگاہوں سے پڑھا۔ لیکن پڑھنے کے بعد توقعات غلط ثابت ہوئے اور معلوم ہوا کہ اُن کی حیثیت صرف ایک جامع ناقل کی ہے۔ ناقد بلند

---

[۱] جن میں ایک تذکرہ "خازن الشعرا" قلمی قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب تقریباً ۱۲۵۰ء کی تصنیف ہے اور زبان فارسی میں اجملی خاندان کے اُردو اور فارسی شعرا کا تذکرہ ہے اسکے مصنف مولانا شاہ سید علی کبیر عرف میر جان تھے۔ میں نے اسکا اصل نسخہ بخط مصنف، حکیم سید شاہ نذیر احمد صاحب کے پاس دیکھا ہے۔ یہ ایک فاضل شخص ہیں۔ جو مصنف تذکرہ کے نواسے ہیں۔ اور موجودہ سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الہ آباد کے ولی عہد ہیں۔ اگرچہ اس کتاب سے مجھے اس سے زیادہ مدد نہ مل سکی کہ مصنف تذکرہ کے چھوٹے بھائی سید محمد کبیر صاحب رضا اجملی قدسی تخلص بھی خواجہ آتش کے شاگرد تھے لیکن اسکی زیارت بھی ہونا اتفاق و حسن اتفاق سے کم نہیں افسوس ہے اوراق منتشر ہیں ورنہ شاہ صاحب اسکی نشر و اشاعت کی طرف سے بے نیاز ہیں۔ اسکا ذکر صاحب گل رعنا نے بھی ایک جگہ کیا ہے

اور صاحب بصیرت مورخ کی حیثیت وہ نہیں رکھتے۔ وہ آزاد کی ذہنیت اور مشن کی تائید اور تقلید تو کر سکتے ہیں، مگر اس کی تنقید کا حوصلہ اور تردید کی ہمت نہیں کر سکتے۔

نادرستیٔ بیانِ صاحبِ آبِ حیات "یا نمی دانست یا دانستہ اخفا کردہ است"

چونکہ میرے نتیجۂ تلاش و تحقیق سے مرزا صاحب کا مضمون یا نظریہ جداگانہ ہی نہیں بلکہ مخالف تھا۔ اس لئے اس مضمون میں کہیں کہیں اسکا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ عنوان کا مطالبہ تو یہ تھا کہ میں بھی ان کی سوانح عمری لکھ دیتا۔ لیکن یہ تطویل محض ہو گی۔ اور اسلئے تحصیلِ حاصل۔ قدرِ مشترک اور عام مسلّم حالات کو چھوڑ کر کہ وہ آبحیات۔ گلِ رعنا۔ آبِ بقا میں درج ہیں۔ چند نئے حالات و نتائج جو میری تلاش و تحقیق میں آئے اُن کے حوالہ قلم کرتا ہوں

## سنہ ولادت

گلشنِ بیخار۔ گلِ رعنا۔ آبحیات۔ خمخانۂ جاوید اور سخن شعرا اس باب میں ساکت ہیں۔ آبِ بقا (مصنفہ خواجہ عشرت لکھنوی) میں صفحہ (۹) پر درج ہے "اس اثنا میں نواب شجاع الدولہ بہادر نے اپنے فرزند آصف الدولہ کی شادی کی۔ ...... یہ واقعہ سنہ ۱۷۶۶ء کا ہے۔ یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے[1] گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔

اگرچہ اثر صاحب نے خواجہ صاحب کے حالات میں اور خصوصاً زمانۂ ولادتِ خواجہ کا تعین و اندازہ کرنے میں "آبِ بقا" ہی سے استفادہ کیا ہے مگر خدا جانے کیسے بلا دلیل سنہ ولادت "تقریباً سنہ ۱۷۶۴ء" لکھا ہے۔ لیکن آبِ بقا کی روایت، بعض حالات کے ملانے سے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

(۱) آبِ بقا میں صفحہ ۱۲ پر ہے: "جب میر تقی میر کا انتقال ہوا (سنہ ۱۲۲۵ھ میں) تو آتش اکتالیس برس کے تھے۔" گویا سنہ ولادت سنہ ۱۱۸۴ھ ہے۔

(۲) آبِ بقا صفحہ (۹) پر ہے: "آتش اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی نامکمل تھی کہ باپ نے انتقال کیا۔ مزاج میں آوارہ گردی تھی اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شورہ پشت ہو گئے۔ ...... اس جوہر کے قدردان، فیض آباد میں نواب میر محمد تقی ترقی تھے۔ جو آتش کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے۔ انھیں کے ساتھ ناسخ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آئے۔" (صفحہ ۲۵۹ پر گلِ رعنا میں بھی تقریباً یہی ہے سوا ناسخ کی ہمراہی کے)

(۳) آبِ بقا صفحہ ۱۴ پر ہے: "آتش نے ناسخ کے مرنے کی خبر سنی تو چیخ مار کر رونے لگے"... کہنے لگے: "میاں ...... ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے۔ مدت تک ہم نوالہ ہم پیالہ رہے"۔

(۴) ناسخ کا لکھنؤ آنا سنہ ۱۱۹۱ھ میں ثابت ہوتا ہے نواب میر محمد تقی ترقی کے ہمراہ۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ یہ پہلے پہل کا آنا تھا، کیونکہ لکھنؤ سے ناسخ کا واپس فیض آباد جانا اور دوبارہ لکھنؤ آنا کہیں سے معلوم نہیں ہوتا۔ اچھا اور ناسخ لکھنؤ آئے اُسوقت جب بقول آزاد لکھنؤ "دار الخلافہ" ہوا یا بقول خواجہ عشرت، جب آصف الدولہ نے سنہ ۱۱۸۸ھ لکھنؤ کو بیت السلطنت بنایا

---

[1] قاموس المشاہیر میں خواجہ آتش کے والد کا نام خواجہ علی محسن چھپا ہے۔ سراج

اس کے دو چار سال کے بعد، (آبِ بقا صفحہ ۱۲)

ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش بھی ناسخ کے ساتھ پہلے فیض آباد میں مدتوں ایک نواب کے نوکر رہے پھر سنہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ اب یہ ہرگز قرینِ قیاس نہیں کہ آتش سنہ ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوئے ہوں اور سنہ ۱۱۹۱ھ میں سات ہی برس کے سن میں بانکوں میں نوکر بھی ہو گئے ہوں اور لکھنؤ آئے ہوں۔ حالانکہ آتش کے حالات میں تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ "باپ کے مرنے کے وقت اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم نا مکمل تھی"۔ ابھی اچھی طرح جوان نہ ہونے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کی موت کے وقت انکی عمر (کم سے کم) گیارہ بارہ برس کی رہی ہوگی اور میر تقی کی نوکری اور لکھنؤ آنیکے وقت انکی عمر (کم سے کم) پندرہ سولہ برس کی ہوگی۔ پھر اگر سنہ ۱۱۹۱ھ اُن کا آنا ناسخ کے ہمراہ صحیح مانا جائے تو سوا اسکے چارہ ہی کیا ہے کہ ان کی عمر کو "اسّی بیاسّی" برس سے (جیسا آبِ بقا میں ہے) کچھ زیادہ مانا جائے اور سنہ ولادت کو سنہ ۱۱۸۴ھ سے کچھ پہلے کیونکہ غالباً سنہ وفات متفق علیہ ہے یعنی سنہ ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء۔

یہیں ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب آتش کی عمر، میر تقی میر کی وفات کے وقت اکتالیس برس کی (یا کچھ زیادہ) تھی تو میر صاحب نے اپنے نکات الشعراء میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر صاحب نے یہ کتاب اپنے شباب کے زمانہ میں دلی میں لکھی تھی اور خواجہ صاحب کی شہرت بعد میں ہوئی۔

## آتش اور دلی

آزاد نے خواجہ کے نام کے ساتھ فیض آباد تک کا نام تو لکھا نہیں، دلی تو پھر بھی دُور تھی۔ لکھتے ہیں:۔ "باپ دلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں جا کر سکونت اختیار کی"۔ اب اس مجمل جملہ سے خواہ یہ سمجھ لیجئے کہ باپ ہی نے دلی چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی (اور یہ صریحاً غلط ہے) خواہ یہ نتیجہ نکال لیجئے کہ خواجہ آتش لکھنؤ میں جا کر رہ پڑے (فیض آباد کا ذکر ندارد) آبِ بقا اور گلِ رعنا میں ہے کہ "فیض آباد میں پیدا ہوئے اور مرزا تقی کے ساتھ لکھنؤ گئے"۔ لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آتش بھی کبھی دلی گئے تھے یا نہیں۔

ہمکو کلیاتِ آتش۔ ردیف نون میں ایک غزل ملتی ہے۔ "اُلجھا ہے دل بتوں کے گیسوئے پُرشکن میں"۔ الخ ان اشعار کو پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچپن کی مشق اور ابتدائی کلام ہے۔ ذیل کے اشعار کسی کہنہ مشق اور ذی رتبہ شاعر کے منہ پہ نہیں کھلتے۔

سنبل سے بال اُس نے جس وقت سے مُنڈائے ۔۔۔ کنگھی وواکی خاطر ملنے لگی چمن میں
عطر گلاب مل کر حلقہ میں یار بیٹھا ۔۔۔ بلبل پکڑنے آیا صیّاد انجمن میں
تُرکِ فلک ہی سپاہی۔ ظاہر ہے تُرک اپنا ۔۔۔ عاقل جو ہو وہ کر لے تمیز مرد و زن میں
اُسکو دکھا کے تو نے اُس پہ جو تیر جوڑا ۔۔۔ پھروں رہی لڑائی شیر اور گرگدن میں۔ وغیرہ

اسی غزل میں ایک شعر ہے:۔

اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہے ہمارے ۔۔۔ نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نورتن میں

غور کیجیئے دہلی کی تخصیص "ہمارے" کے لفظ کے ساتھ کیا بتاتی ہے اور "اپنے اکبر" کا لہجہ کس امر پر روشنی ڈالتا ہے۔
مطلب شعر کا یہ ہے کہ آتش اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی اور خود شہر دہلی کی تعریف میں کہتا ہے کہ ہمارے شہر دہلی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم ہیچ ہے۔ اور ہمارے بادشاہ اکبر ثانی کے دربار میں نو آسمان مصاحب ہیں جو "نو رتن اکبری" کا جواب ہیں۔ صاف طور پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آتش دلّی میں پیدا ہوئے اور وہاں کچھ مدت تک رہے۔ کیونکہ یہ میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ اُن کے حالات کچھ صاف صاف نہیں ملتے۔ لیکن اتنا تو اس شعر سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ آتش چاہے فیض آباد میں پیدا ہوئے ہوں مگر وہ دلّی بھی گئے اور رہے ہیں۔ اور آبائی وطن کو خود بھی دیکھ کر یہ غزل وہاں کہی ہے اور گو وہ لکھنؤ آکر مصحفی کے شاگرد ہوئے مگر ایک شاعر تلمذ سے قبل بھی کچھ کہہ لیتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آتش نے فیض آباد یا لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ غزل کہی ہو۔ لیکن میرے خیال میں اگر آتش دلّی نہ گئے ہوتے تو "اپنے اکبر" اور "ہماری دلّی" جیسے حجتی لہجہ میں تعریف نہ کرتے آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ مجھے اعتراف ہے کہ یہ میرا ایک احتمال و قیاس ہے۔ جسکی تائید شاید آئندہ کسی انکشاف و تحقیق میں ہو سکے۔ اسوقت اپنی تائید میں دو باتیں کہہ سکتا ہوں:۔

(۱) گل رعنا صفحہ ۳۶۲ و ۳۶۴ پر ہے: "آتش کی غزلوں میں دلّی کے ٹھیٹ الفاظ مثلاً انکھڑیاں۔ زور۔ بل بے۔ میرے شامل۔ بھاریاں وغیرہ زیادہ ملتے ہیں۔ عجب نہیں یہ اُن کا ابتدائی کلام ہو۔"

(۲) آزاد نے لکھا ہے کہ اُن کے اکثر اشعار ضائع ہو گئے۔ ممکن ہے ضائع شدہ غزلوں میں اور باتیں بھی دلّی کی بابت رہی ہوں۔

## اُستادی نزاع

آزاد نے اس بحث کو بہت آب و رنگ دیکر لکھا ہے۔ اس سے بظاہر اُسکی دو غرضیں معلوم ہوتی ہیں۔
(۱) آتش کو چونکہ آزاد شیعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اُسلئے اُسے ایک سُنّی اُستاد مصحفی سے لڑا دینا چاہا اور باور کیجیئے کہ اگر ان کو اس قسم کی کوئی اور بات بھی ملجاتی تو وہ انشا اور مصحفی کا سا معرکہ آتش و مصحفی کے درمیان پیدا کر دیتے۔
(۲) آزاد، جو وطناً دہلوی اور مذہباً لکھنوی تھے۔ جہاں لکھنؤ پرستی میں لکھنؤ کو "دارالخلافہ" جیسے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ وہ اس فکر میں بھی ہیں کہ لکھنؤ کی زبان کو دلّی کی زبان کی تقلید سے آزاد کر دکھائیں۔ اور اس خیال میں جان اُسوقت تک نہیں پڑ سکتی تھی۔ جبتک آتش و ناسخ کو (جن سے لکھنوی زبان کی عمارت قائم سمجھی جاتی ہے) کس طرح مصحفی سے الگ نہ کر لیا جائے۔ ناسخ کو تو اُس نے صاف الگ کر دکھایا ہے آتش تو اُن کے لئے اُس نے ذیل کا قصہ تصنیف کیا۔

آزاد کے الفاظ یہ ہیں:۔ (آبحیات تذکرہ آتش صفحہ ۳۸۰)

"کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرا جو شاگردانِ الٰہی ہیں۔ مجازی اُستادوں کے ساتھ انکی بگڑتی ہی چلی آئی۔

۵۱ ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی شعاع تخلص ابن شاہ عالم۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۸۰۶ء میں بادشاہ بنے اور ۳۱ سال سلطنت کرکے سنہ ۱۸۳۷ء میں انتقال کر گئے (قاموس المشاہیر)

چنانچہ اُن کا بھی اُستاد سے بگاڑ ہوا۔ خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی۔ اور اُن میں حق کس کیطرف تھا۔ آج اصل حقیقت دُور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے۔ مگر جہاں سے کھلّم کھلا بگڑی اُسکی حکایت یہ سُنی گئی کہ......"

اس کے بعد وہی بگڑا، کفن بگڑا کے مشاعرہ کا قصہ لکھا ہے کہ آتش نے اپنے اشعار اُستادوں کو سنا کر کچھ تعلّی کی مصحفی نے انکے شعروں کے جواب میں دو شعر کہہ کر ایک لڑکے سے پڑھوا دئے۔ جب مشاعرہ میں ان اشعار کی واہ ولی تو آتش کو شبہ ہوا اور اُستاد سے بگڑ کر کہا کہ "یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھریاں مارتے ہیں۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا منہ تھا جو ان قافیوں میں شعر نکالتا۔ مگر مصحفی کے یہ اشعار آتش کے اشعار سے کمزور تھے (یعنے آزاد کے الفاظ نقل نہیں کئے کہ طول ہو جاتا اسکا خلاصہ لکھدیا)

خواجہ آتش کی سپاہیانہ وضع اور اُس پر آزاد کی رنگین اور فریب کار تحریر۔ نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہرگز قابل حیرت نہیں کہ یہ روایت شہرت پا گئی اور بعد میں مقلدین تذکرہ نویسوں نے (الا ماشاءاللہ) اسکو اپنے یہاں نقل و درج بھی کر دیا۔ لیکن عقل دُور رس اس پر حسب ذیل نتیجیں قائم کرتی ہے:۔

(۱) ہمارے سامنے گل رعنا موجود ہے وہ اس خصوص میں ساکت ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو صاحب گلِ رعنا جنھوں نے آتش کی موت کا حال بالکل آزاد ہی کے الفاظ میں لکھدیا ہے۔ ضرور اسکو اپنی کتاب میں لکھتے۔

(۲) شعر الہند میں بھی یہ روایت نہیں ہے۔

(۳) تذکرہ آب بقا میں آتش کے حالات، آب حیات سے بہت زائد لکھے ہیں۔ وہ اس مشاعرہ کا ذکر بایں الفاظ کرتے ہیں (صفحہ ۱۶) "تحسین گنج میں میاں تحسین علی خاں...............

خواجہ سرا کے ہاں مشاعرہ ہوا، چلن بگڑا، کفن بگڑا، اس میں بھی پالا آتش کے ہاتھ رہا اور ناسخ کی غزل کمزور رہی"۔

خواجہ عشرت، لکھنوی ہیں اور شاد پیر و میر کے شاگرد۔ اُردو زبان کی خدمت، تاریخ نویسی، لغت نویسی، قواعد نویسی سے ایک مدت سے کرتے چلے آتے ہیں۔ اور اگرچہ اُنھوں نے ناسخ و آتش کا زمانہ نہیں پایا مگر پرانوں کی آنکھیں دیکھیں اور قصّے سُنے ہیں ــ خود تلاش و تحقیق اور تفتیش و جستجو کا مادّہ رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ان کو لکھنؤ کے حالات کا (گو وہ ماضی ہی کیوں نہ ہوں) بمقابلہ آزاد کے (جو غالباً لاہور میں آب حیات لکھنے بیٹھے تھے۔) زیادہ اور صحیح تر معلوم ہونیکے موقعے حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیا بہ لحاظ مقدار و مواد اور کیا بلحاظ اعتبار و استناد اُنکے ہاں خواجہ آتش کے زیادہ حالات ہیں۔ وہ اس خاص مشاعرہ کا موقعہ اور محل تک بتا رہے ہیں۔ مگر اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو لکھنؤ جیسے مقام پہ خواجہ عشرت جیسے جوئندہ کو اس روایت کا ملنا ناممکن نہ ہونا چاہئیے۔ اچھا روایت نہ ملنے کو بھی جانے دیجئے۔ خواجہ عشرت نے آبحیات کے بعد اپنا تذکرہ لکھا ہے۔ وہ بھی مثل دیگر تذکرہ نویسوں کے اس کو اپنے یہاں نقل کر سکتے تھے مگر نہیں نقل کرتے۔ آخر کیوں؟ میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے اس روایت میں اصلیت کا شائبہ نہیں پایا، اس لئے اسے اعتبار و استناد کے پایہ سے ساقط سمجھا۔ پھر ذرا غور تو کیجئے (نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا) بھری محفل مشاعرہ میں

جب یہ گفتگو پیش آئی تھی تو ناممکن ہی ہے کہ لوگوں میں مشہور نہ ہوتی اور خواجہ عشرت کو یہ روایت کسی طریق سے نہ پہونچ سکتی اور آزاد کو لاہور میں پہونچ جاتی!

(۳) آتش ایک صلح کل اور بقول آزاد "سیدھے سادے بھولے بھالے آدمی تھے، ان اوصاف کے آدمی پر تو یہ بات کچھ کھلتی نہیں کہ ذرا سی بات پر اُستاد سے سرِ مجلس بگڑ بیٹھے۔ شاگرد کی تعلیوں پر اُستادوں نے اکثر اسطرح کی در پردہ تنبیہیں کی ہیں۔ اور سعادتمند شاگرد ہمیشہ اُس سے متنبہ اور شرمندہ ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے جو رویہ آتش کا پیش کیا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آتش کو سعادت مندی چھو نہیں گئی تھی اور نیک نفسی اور حیا کا اس میں نام و نشان نہ تھا۔ وہ اس استاد کی مطلق قدر نہ کر سکا۔ جو میر تقی کے پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔

(۴) خود آزاد کہتے ہیں کہ مصحفی کے اشعار آتش کے اشعار سے کمزور تھے۔ اس صورت میں آتش کا رویہ کتنا مذموم نظر آتا ہے کہ وہ اپنے اشعار سے کمزور اشعار کو اپنے ایک اُستاد بھائی کے منھ سے سُنکر تاب نہ لاسکے اور سیدھے استاد سے جا کر اڑ مرے۔

(۵) ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر آزاد کو آتش کا ایک مسلم الثبوت اُستاد سے بگاڑ دکھانا تھا تو اصولاً کوئی مستند روایت بیان کرتے! راوی کا ذکر کرتے۔ لیکن اس طرز تاریخ نویسی اور اس عقل و فہم کو ملاحظہ فرمایئے کہ ایسی مبہم روایت کو یوں تحریر فرماتے ہیں "مگر جہاں سے کھلم کھلا بگڑی اسکی حکایت یہ سُنی گئی ہے" اے سبحان اللہ یہ تو حال تھا نفس روایت کا۔ اب آزاد ہیں کہ اسکو تائید و تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ان مرعوب کُن اور احتمال انگیز الفاظ سے کہ "خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی اور حق کس کی طرف جا رہا ہوگا، آج اصل حقیقت دور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے" اللہ اکبر! جب یہ شبہات روایت بیان کرتے وقت خود ہی پیدا کر دئے جائیں تو کیوں نہ یقین کر لینے کو جی چاہے۔ اور کیوں نہ کسی آیندہ زمانہ میں کوئی صاحب اتنی گنجائش پا کر اُٹھ کھڑے ہوں کہ "جی ہاں اب معلوم ہوا۔ وہ جزئیات یہ ہیں۔ اور حق آتش کی طرف تھا" پھر یہ کہ "اصل حقیقت کھلنی مشکل ہے مگر صاحبِ بصیرت اور صاحبِ فراست ناقد کے نزدیک آسان ہے۔

**مذہب** | مذہب کی بحث دیکھکر جو خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونگے۔ ہمیں اُن کا پورا علم و احساس ہے۔ پھر بھی ہم اس بحث کو چھیڑتے ہیں۔ محض اس مقصد سے کہ ایک شخص کے کلام کو پڑھکر اور تذکروں میں اُسکے حالات دیکھکر جو صحیح نتیجہ نکلتا ہو اُسکو ظاہر کیا جائے۔ بنابریں اگر مجھے آتش کے تشیّع مفروضہ سے انکار ہو تو اسکی وجہ "تنگ نظری یا کسی مشہور شاعر کو شیعہ نہ دیکھ سکنا" نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ درآنحالیکہ ہم عُرفی و قاآنی۔ انیس و دبیر۔ سودا و ناسخ کو مشہور اور پھر شیعہ جانتے اور مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ آتش جیسے بنگ نوش، رند و آزاد اس قابل بھی نہ تھے کہ اُن کو خلاف واقع طور پر محض زبردستی کھینچ تانی سے سُنّی ثابت کیا جائے نہ تسنن کو اس سے چار چاند لگ جائیں گے نہ تشیّع میں کوئی بٹہ لگ جائیگا نہ ہم اس بارہ میں اوروں کی طرح تاویلاتِ بارہ اور تحریفات رکیکہ کام میں لائیں گے۔ بلکہ جو کچھ از روئے تحقیق ثابت ہوگا اُسے دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔

آزاد نے اس بیان کو بڑی ترکیب سے لکھا تھا۔ مرزا اثر صاحب نے نہ صرف اسکی تائید کردی بلکہ اسکے مشن سے دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ یعنی اُس نے تو گول لفظوں میں لکھا اثر صاحب نے اس سے نتیجہ نکال کر صاف صاف لکھدیا کہ وہ شیعہ تھا حالانکہ کوئی تذکرہ حتیٰ کہ خود آزاد بھی مرزا صاحب کا ساتھ نہیں دیسکتے۔

آزاد و اثر صاحبان کی طرز تحریر اور افتادِ طبع کو دیکھکر حیران ہوں کہ تذکرہ نویسوں اور خاصکر اپنے یہاں کے تذکرہ نویسوں کی اس روش کی داد دوں یا فریاد کروں کہ یکے بعد دیگرے صدہا شعرا کا تذکرہ کرتے چلے جاتے ہیں، مگر مذہب کا حال تفصیلی تو در کنار، کوئی اشارہ تک اُسکی جانب نہیں کرتے اور نہیں کرنا چاہتے۔ معلوم نہیں یہ اُنکی فراخدلی اور رواداری تھی، یا بے خبری اور لاعلمی، بہر حال شریعت، سیرت نگاری اور مذہب ادبیات کا یہ ایک بہت بڑا گناہ تھا جو اُن سے سرزد ہوا اور میں سچ کہتا ہوں کہ انقلاب زمانہ کا دیوتا اُنکو اس گناہ پر بغیر سزا دیئے نہیں رہ سکتا تھا۔ اُسکی سزا وہ ہے جو دوسرے لوگ موقع پاکر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں اب صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے آکر بنیادی اینٹ رکھدی دوسرے نے بنیاد بھروی تیسرے نے پوری عمارت اُس پر بنا کھڑی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس بارہ میں "اصل حقیقت دور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے"۔ اور اگر آج بعض رسالے اور مضامین نہ شائع ہوئے ہوتے تو یقیناً ہمکو روز روشن میں رات کی تاریکی، چاند، ستارے سب کچھ دکھائے اور منوائے جا سکتے تھے اور اسوقت سوا ماننے کے اور چارہ ہی کیا ہوتا۔ بہر حال آتش کی شیعیت کے ذیل میں اتنی باتیں بیان کیجاتی ہیں:۔

(۱) آزاد نے آبحیات صفحہ ۳۷۴ تذکرہ آتش میں ایک بات بہت پردہ پردہ میں لکھی ہے کہ "۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہوتا تھا۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی اور رسوم ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کیں۔ بی بی اور ایک لڑکا لڑکی خورد سال تھی اُنکی بھی سرپرستی ہی کرتے رہے"۔

میر دوست علی خلیل آتش کے شاگرد تھے۔ اور شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ آزاد کا مطلب غالباً یہ ہے کہ چونکہ ایک شیعہ نے تجہیز و تکفین کی لہذا آتش کی موت اور دفن و کفن وغیرہ امور شیعوں کی طرح ہوئے اور آتش شیعہ تھا۔

(۲) آبحیات میں صفحہ ۳۸۳ پر ایک روایت سے آتش کو شیعہ گردانا جاتا ہے "خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقہ سنت و جماعت سے تھا اُس نے ویسی ہی نماز سکھادی اور یہ کہدیا کہ اُستاد! عبادتِ الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرہ میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کرکے اُسی طرح نماز پڑھا کرتے۔ میر دوست علی خلیل انکے شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش تھے۔ ایک دن اُنھوں نے بھی دیکھ لیا، بہت حیران ہوئے۔ یہ نماز پڑھ چکے تو اُنھوں نے کہا کہ "اُستاد آپ کا مذہب کیا ہے؟" فرمایا "شیعہ۔ ہیں! یہ کیا پوچھتے ہو؟" اُنھوں نے کہا "کہ نماز سنیوں کی"۔ فرمایا کہ "بھئی میں کیا جانوں فلاں شخص سے میں نے کہا تھا اُس نے جو سکھا دی سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی

دو دو نمازیں ہیں"۔ اُسی دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے"۔

(۳) اثر صاحب نے اکتوبر کے زمانہ میں لکھا ہے "مذہب شیعہ تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں غزل"۔ (اسکے بعد وہ غزل لاتحف ایدل اور شاہ نجف ایدل والی نقل کی۔ جس کے مقطع میں یہ مصرعہ بھی ہے "شیطان کے نطفہ سے ہے وہ ناخلف ایدل")

لیکن اسکے جوابات لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کراؤں۔

(۱) ہم نے آجتک یہی سُنا تھا (اور نہ صرف ہم بلکہ ایک دنیا اسکو جانتی ہے) کہ شیعوں کے ہاں تصوف کوئی چیز نہیں۔ درویشی، کشف و کرامت، پیری و مریدی، فیضِ باطنی، صفائے قلب وغیرہ ان کے نزدیک ڈھکوسلے ہیں اور الفاظِ بے معنی! یہی مینے اپنے سابق مضمون "میرزا غالب کے مذہب" میں مختصراً لکھا تھا۔ لیکن ضرورت ہے کہ آج ذرا تفصیل سے اس پر اظہارِ خیال کروں۔

سوال یہ ہے کہ شیعیت و تصوف میں تضاد ہے یا نہیں اگر تضاد ہے تو ان دونوں کا اجتماع کیا معنی اور اگر توافق ہے تو خدارا مجھے بتلایئے کہ صوفیوں کو بُرا کہنا کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ چمنستانِ لکھنؤ کا ایک بلبل یوں نغمہ سنج ہوتا ہے۔

این کلام صوفیانِ شوم ہیست ، مثنوی مولوی روم ہیست ،

صوفی اندر باغ چوں ہو ہو کند ، فاختہ بر حالِ او کوکو کند ،

(۲) شیعوں اور سنیوں میں بلحاظ عقائد تھوڑا ہی سا فرق ہے۔ اسلئے ہر سنی کو نہایت آسانی سے شیعہ کہا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ کچھ آج ہی نہیں قرونِ اولےٰ اور وسطیٰ میں بھی مشاہیر کا مذہب و عقیدہ مخفی یا کم از کم مشتبہ کرنیکی ہر ممکن سعی کی گئی ہے۔ روایتیں گھڑی گئیں۔ الحاقی اشعار اور جعلی رسالے شائع کئے گئے، شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے رسالہ "تحفہ" میں لکھتے ہیں کہ شیعہ ہمیشہ در پردہ اس کی کوشش کرتے رہے ہیں، مطلب اُن کا یہ ہوتا ہے کہ آج نہ سہی تو سو پچاس برس کے بعد لوگوں کو اس کے ذریعہ سے غلط راہ پر ڈالا جا سکے شاہ صاحب نے مثالیں لکھی ہیں کہ ابن قتیبہ (سنی حنفی) کی کتاب "المعارف" کے مقابلہ میں ایک شیعہ قتیبہ نے بھی المعارف کتاب لکھی۔ ایک کتاب "سرّ العالمین" امام غزالی کے نام سے لکھی گئی۔ تاریخ طبری اصل کمیاب ہے۔ اس کا مصنف سنی تھا۔ ایک شیعہ نے اس کے ترجمہ اور اختصار میں خاصی آمیزش کردی اور آج وہی پائی جاتی ہے"۔ اسی طرح خواجہ حافظ کے نام سے الحاقی غزلیں اور قصیدے ان کے دیوان میں داخل کئے گئے سعدی و روم کو تشیع سے منسوب کیا گیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے نام سے "سرّ الشہادتین" لکھدی گئی۔ یہی صورت غالب میر۔ آتش کے بارہ میں بھی پیش آئی ہے اور آزاد در پردہ یہ کام کر گئے ہیں۔

باقی آیندہ

سراج الحق

# خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش

## بسلسلہ ماسبق

اب وجوہ تشیع کے جوابات سنیئے۔

۱۔ آزاد کی پہلی روایت کا حال یہ ہے کہ (الف) آتش کے ایک ہی لڑکا تھا۔ خواجہ محمد علی جوش نامی کوئی لڑکی نہ تھی۔ (آب بقا صفحہ ۱۱ اور گل رعنا صفحہ ۲۶۰)

۲۔ آتش کی بیوی آتش کی زندگی ہی میں مرگئی تھی۔ آب بقا صفحہ ۱۳ پر ہے کہ جب آتش نابینا ہو گئے تو محمد علی جوش کی شادی ایک باہمت ہندو شاگرد کے اصرار اور خرچ سے آتش نے کی۔ جوش سہرا پہن کر آتش کے پاس گئے تو آتش رو دیے۔ لوگوں نے کہا "اس وقت آپ روتے کیوں ہیں؟" کہنے لگے "اس کی ماں مرگئی ورنہ وہ اس کو سہرا پہنے دیکھ کر خوش ہوتی۔ میں نابینا ہوں دیکھ نہیں سکتا"۔

۳۔ آتش کی وفات کے وقت اُن کا بیٹا جوش شادی شدہ جوان تھا نہ کہ خرد سال۔ (گل رعنا صفحہ ۲۶۰: بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔)

دیکھیے آزاد نے ایک سانس میں کتنے جھوٹ بولے۔ بیوی اور بیٹی کا بعد وفات آتش کا زندہ رہنا غلط۔ لڑکے کا خرد سال ہونا غلط۔ جس فقرہ میں اتنی باتیں خلاف واقعہ ہوں تو کیونکر اُس کے اس حصہ کو صحیح مانا جاسکتا ہے کہ ایک شیعہ نے آتش کی تجہیز و تکفین کی اور اس سے ان کی موت پر شیعی موت کا اطلاق ہو سکے۔ کیونکہ یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ایک جوان بیٹے نے تجہیز و تکفین نہ کی ہو بلکہ ایک غیر نے کی ہو۔

۴۔ آب بقا میں صفحہ ۱۳ پر خلیل کی سعادتمندی کا ذکر ضرور ان الفاظ میں ہے کہ "آخر وقت میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی۔ میر دوست علی خلیل ان کی خدمت کرتے تھے"۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس نے شیعی تجہیز و تکفین بھی کی ہو۔ بات فقط اتنی ہی تھی کہ خلیل نے آتش کی زندگی اور بڑھاپے میں خدمت کی۔ آزاد نے اس پر اتنا حاشیہ چڑھا کر یہ افسانہ بنا دیا۔

۵۔ آب بقا میں ناسخ کا مذہب۔ انکی قبر کی شکل (کہ وہ حسب دستور اہل تشیع زمین سے ملی ہوئی ہے) تو درج ہے مگر آتش کے بارہ میں کچھ درج نہیں۔ سوا اس کے کہ گھر ہی میں دفن ہوئے۔

۲- میر انیس کی روایت = راوی کا نام پڑھ کر ناظرین شاید مرعوب ہو جائیں اور آزاد کی چال بھی یہی تھی بقول غالب

؎ غازیاں ہمراہ خویش آورد از بہر جہاد ہو تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ ہست

لیکن میر انیس کی شہرت و عظمت صرف مرثیہ گوئی کی بنا پر ہے روایت۔ ثقاہت۔ تاریخ میں تو ان کا کوئی پایہ نہیں۔ ان حیثیتوں سے وہ ایک عام شخص تھے۔ اب روایت پر تھوڑی ہی سی درایت کی نظر ڈالنے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میر انیس کی اس روایت کا وجود آب حیات سے باہر بھی کہیں ہے؟ جواب نفی میں ہوگا۔

آتش کے خاندان میں تسنن اور تصوف متوارث تھا اور اباً عن جدٍ پیری مریدی کا طریقہ چلا آتا تھا۔ خود آتش اس باپ کی گود میں پلا تھا جس کی بابت سب تذکرہ نویس متفق اللفظ ہیں کہ فقیر سالک تھا۔ پھر باپ کے انتقال کے وقت تک آتش اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ اور باپ اُسوقت مرا ہے جب "آتش ابھی اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم ناتکمیل تھی"۔

کیوں صاحب! وہ کونسا مسلمانوں کا اور خاصکر درویشوں کا گھرانہ ہوگا جس کا بچہ بچپن سے اپنے بزرگوں کو نمازیں پڑھتے نہ دیکھے گا؟ اور اس کو نماز نہ سکھائی جائے گی؟ اور اچھی طرح جوان ہونے کی عمر تک بھی وہ جانے گا کہ ہم شیعہ ہیں یا سنی۔ اور شیعوں کے ہاں ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ اور سنیوں کے ہاں ہاتھ باندھ کر؟ خود ہمارے گھر میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی جاتی ہے یا ہاتھ کھول کر؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لڑکا آوارہ ہو تو خود نماز کا پابند نہ ہو۔ لیکن ہر مسلم کا بچہ نماز کی ہیئت اور دونوں نمازوں کا فرق جانتا ہے۔

۳- کیا آپ ایسے شیعہ کا تصور کر سکتے ہیں کہ عقائد سے تو اتنا باخبر ہو کہ بقول اثر صاحب یہ مصرعہ کہہ جائے کہ:-

شیطان کے نطفہ سے ہے وہ ناخلف یزید

لیکن اعمال سے اتنا ناواقف ہو کہ دونوں نمازوں کا فرق جانے نہ شیعہ نماز اُسکو آئے؟

(۴) لکھنؤ میں آتش و ناسخ کا زمانہ، شیعیت اور مذہبیت کے سخت جوش کا زمانہ تھا۔ ناسخ صاحب آخر شیعہ ہو ہی گئے آتش ایسے جوش کے زمانہ میں ہرگز شیعہ نماز اور دونوں نمازوں کے فرق سے بیخبر نہیں رہ سکتے تھے؟

(۵) بقول آزاد "میر دوست علی خلیل شاگرد خاص تھے اور خلوت و جلوت کے حاضر باش۔ آتش کو جب اپنا مذہب شیعہ معلوم ہوا تو کیوں نہ اپنے شیعہ شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش ہی سے نماز سیکھ لی۔

(۶) میر دوست علی خلیل شیعہ تھا۔ پھر اُن کے اُستاد آتش کی اتنی بیخبری کے کیا معنے؟

(۷) آتش جو بقول اثر صاحب ایسی غزل کہے اور خلیل ہر وقت اُسکی مصاحبت میں بھی رہیں۔ اُس کو اپنا شیعہ ہونا معلوم بھی ہو پھر بھی آتش نماز پڑھتا ہے تو سنیوں ہی کی؟ کسقدر حیرتناک امر ہے؟

(۸) آزاد نے کیا خوب فقرہ سوچکر لکھا ہے کہ "شاگرد نے کہہ دیا کہ استاد! عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی"۔ شاید آزاد نے اس لئے لکھا کہ اہل سنت کے یہاں کھُلم کھُلا جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ انکے یہاں کوئی مخفی عبادت نہیں نہ وہ کسی کو کسی مخفی عبادت کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ فرضی نماز سکھانے میں اُس شاگرد کی کون سی مصلحت تھی؟

کہ اُس نے عبادت چھپانے کو کہا۔ غرض یہ ثابت ہے کہ بچپن میں نہیں عمر کی پختگی میں آتش نے سینوں کی نماز پڑھی۔ اس امر کو اس سے ملائیے کہ آتش سنی اور صوفی باپ کے یہاں پلے تھے۔ انھوں نے سینوں کی نمازیں دیکھی تھیں۔ تصوف کے اُن مدارج اور نکات سے آگاہ تھے۔ جنکی تفصیل اثر صاحب نے کی ہے۔ نیز آتش اس کے قائل تھے کہ "رند مشرب ہوں مجھکو کیا ہوئے + مذہبوں میں جو اختلاف ہوا" نتیجہ صاف یہ نکلتا ہے کہ آزاد ہوں یا انیس سب نے اس معاملہ میں غلط بیانی سے کام لیا۔ اب اگر فی الحقیقت میر انیس نے یہ روایت بیان نہیں کی تھی بلکہ یہ بھی آزاد کی صنعت تھی تو اس کے ذمہ دار بھی آزاد اور اس کا وبال بھی آزاد ہی کے سر۔

۳۔ آتش کے بعض اشعار۔ مرزا صاحب کی پیش کردہ غزل اوپر لکھ آیا ہوں اور اگر مجھے بھی اُس کے ایسے ہی اشعار کی جمع و تلاش مقصود ہو تو چند اور اشعار اُسکی شیعیت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

قسم اول۔
(الف) لا تحف ایدل والی غزل۔
(ب) دیوان دوم کی پہلی غزل = دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا۔
(ج) دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو ÷ یہ مشت خاک ہوئے کربلا کی خاک سے پیدا۔ (صفحہ ۹)
(د) آتش کی التجا ہے یہی تم سے یا علی ÷ صدمہ نہو فشار لحد کے عذاب کا۔ (صفحہ ۳۴)
(ہ) آتشِ غمِ حسین میں رو ہنس ہا ہی کیا ÷ سطریں کی سطر نامۂ عصیاں سے دور ہوں۔ (صفحہ ۱۰۹)
(و) ہر جمعہ کو ظہور کا رہتا ہوں منتظر ÷ مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا (صفحہ ۲۱۲)
(ز) پیروی پیشوا کی لازم ہے ÷ رو سیہ منکر امامت کا (صفحہ ۲۲۱)

---

(ط) دستِ علی کی ضرب کا جنبش میں ہے اثر ÷ ان ابروؤں میں معجزہ ہے ذو الفقار کا (صفحہ ۴۷)

قسم دوم:۔
(الف) سر سے حاضر منقبت میں بے تامل ہو گیا ÷ مدحِ حیدر میں کمیتِ خامہ لدل ہو گیا۔
(ب) خوں ریز جس قدر کہ ہو اس سے عجب نہیں ÷ آتش فراق یار بدر ہے یزید کا (صفحہ ۲۱۴)
(ج) اک سال میں دس دن بھی جسے غم نہیں ہوتا ÷ وہ شہر ہے جس میں کہ محرم نہیں ہوتا (صفحہ ۲۲۱)
(د) یا علی لشکر بتِ پندار توڑا چاہیئے ÷ نفس امارہ کی گردن کو مروڑا چاہیئے (صفحہ ۲۵۰)

---

ظاہر ہے کہ مجھے قسم دوم کے اشعار کا تو جواب دینا نہیں ہے۔ ان میں محض کوئی نام آگیا ہے اور اُن سے کوئی شیعی عقیدہ کھلا ہوا نہیں ظاہر ہوتا۔ الف اور ج کے اشعار اگر ایک سنی لکھنؤ میں بیٹھ کر کہے تو تعجب کا مقام نہیں (ب) میں غم فراق کو یزید سے بڑھ کر سمجھنا اور ابروؤں کو ذو الفقار کا اثر ماننا محض تشبیہی انداز بیان ہے اور نکتہ آفرینی۔ یا علیؑ لشکر بت توڑنا اس میں صریح اشارا ہے اس حدیث کی طرف جس میں ذکر ہے کہ رسول اکرم صلعم نے حضرت علیؑ کو بت اور اونچی قبر توڑنے پر مامور

کیا تھا۔ اس قسم کے بیانات تو سنیوں کے ہاں بھی ہیں۔ اور عام ہیں مثلاً

(الف) ذوق کی پہلی غزل کے یہ مصرعے:۔ ۱۔ محبت اہل بیتِ مصطفٰے کی نور بر حق ہے = ۲۔ کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا = ۳۔ غمِ آلِ نبی سے دانہ ہر اشکِ نم میرا = حالانکہ ذوق مسلّم طور پر سنی تھے۔

(ب) سید محمد مبین الدین صاحب مبین مچھلی شہری نے (جو سنی حنفی اور داغ مرحوم کے ارشدِ تلامذہ میں ہیں) ۱۳ رجب کو شیعوں کی ایک مجلس میں تعریفِ جناب امیرؑ میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا ایک مصرعہ مجھے اس وقت یاد ہے۔ ع

وہی علیؑ کہ جو تھے خاتمِ خلافتِ خاص

(ج) اور کسی دوسرے کی مثال کیوں دوں، خود مجھ پر ایک زمانہ حبِ علیؑ کے جوش کا ایسا گزرا ہے کہ جب میں نے مقبول احمد دہلوی کی تفسیر کے رد میں اپنی تفسیر "فبہت الذی کفر" لکھی جو ملک میں شائع ہو چکی ہے۔ اُس کے دیباچہ میں میں نے لکھا تھا کہ محبت علی میں مجھکو وہ شغف اور غلو حاصل ہے کہ میں فضیلتِ شیخین کو بدعت اور ایک امرِ خارج از امورِ دین سمجھتا ہوں" لیکن ان سب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اور یہ سب لوگ بھی شیعہ ہو گئے۔ رہے دوسرے قسم کے اشعار تو

(۱) مجھے سرے سے اسی میں شک ہے کہ یہ اشعار آتش کے ہیں کیونکہ حسب تمہید نمبر ۲ سعدی و رومؔ پر تشیع کا اتہام حافظ کے نام سے الحاقی غزل اور قصائد۔ فردوسی کے نام سے ہجو محمود میں الحاقی اشعار۔ کتابوں اور تصنیفوں میں تحریف جب ہمارے سامنے ہے تو آتش کے کلام میں الحاقی اشعار کا ہونا کون سی بڑی بات تھی۔ آتش کا دوسرا دیوان تتمہ ہے جو انکی وفات کے بعد مرتب اور شائع ہوا ہے۔ اس لئے اس میں کافی موقع الحاق کا تھا۔ چنانچہ ہمکو پہلی ہی غزل بلا مقطع کے پانچ شعر کی ملتی ہے غالباً پنجتن کی رعایت سے اور اس میں شروع سے آخر تک ہر شعر میں شیعیت بھری ہے۔ پہلا دیوان اگرچہ اُن کی زندگی ہی میں طبع اور شائع ہو چکا تھا۔ لیکن اُس میں بھی الحاقی اشعار بیچ بیچ میں داخل کئے جا سکتے تھے۔ کیونکہ شاگردِ خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش جو صاحب تھے وہ شیعہ ہی تھے اور آتش جیسے بنگ نوش رند اور لااُبالی شاعر سے غالباً اس بیدار مغزی اور باخبری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اُس نے اپنے نام سے شائع شدہ دیوان کی ہر جگہ سے تنقیح اور جانچ کر لی ہو۔

(۲) آتش کے حالات و صفات، اطوار و اشعار آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے ایک حد تک آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان اوصاف کے آدمی سے ہم کو کس کس قسم کی باتوں کی توقع ہو سکتی ہے۔ وہ زیادہ تر تو وراثت کے تصوف کہنے پر زیادہ مائل نظر آتا ہے یا لکھنؤ کی فضا سے متاثر ہوتا ہے تو اس حد تک کہ کنگھی چوٹی۔ محرم کرتی کے اشعار بھی کہہ جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ غزل کے مطالبات اور خصوصیات سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ غزل، غزل ہے نہ کہ مرثیہ و سلام۔ تغزل میں فرقہ وارانہ عقائد اور سخت لہجہ اور تبرے کی گنجائش کہاں؟ چونکہ اس سے سخت تنگ نظری ٹپکتی ہے۔ اس لئے عموماً اساتذہ اور ثقہ لوگ اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ آتش جس کے بارہ میں اہلِ نظر کا خیال ہے کہ غالب سے کسی طرح تغزل کی بلند پروازیوں میں کم نہ تھا، ہرگز اس کلیہ سے بیجز اور اس اُصولِ اخلاق سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ تنگ نظر اور فرومایہ شعرا ایسا کر سکتے ہیں۔

(۳) مسلمان صاحب دیوان شعرا کا طریقہ یہ رہا ہے کہ برکت کے خیال سے شروع میں حمد و نعت (اور اگر شیعہ ہو تو) منقبت ضرور کہتے ہیں۔ آتش کے پہلے دیوان میں سوائے حمد معرفت کے شروع کے سات آٹھ صفحات تک کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ آتش کیسا شیعہ تھا اپنی زندگی میں شائع ہونے والے دیوان میں نہ نعت کہی نہ منقبت۔ اور منقبت کہی تو وہ ردیف "لام" میں جا چھپی۔

(۴) کسی شیعی شاعر کا بھی یہ رویہ دیکھا نہیں گیا کہ شروع کی منقبت کے علاوہ غزل کے ہر شعر میں ایک ہی عقیدے کا اظہار ہو۔ ایک مذہب کی تبلیغ ہو۔ آتش ہی نے اپنے دیوان صفحہ ۲۴۴ پر ایک مطلع لکھا ہے۔ (ورد زباں جناب محمدؐ کا نام ہے۔ قابل درود پڑھنے کے اپنا کلام ہے) بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ غزل نعتیہ ہے۔ مگر سوا اس شعر کے اور ایک شعر بھی نعت میں نہیں۔ اور یہ بات اسی مذکورہ اصول کے ماتحت ہے کہ ہر شعر میں کسی عقیدے کا اظہار معیوب ہے۔

(۵) اسی نعتیہ مطلع کے بعد ایک موقع منقبت کے ذکر کا تھا مگر آتش کی توجہ اس طرف نہیں ہوتی۔

(۶) پھر کیا ایک واقعی شیعہ شاعر کے ہاں شیعیت کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ پوری پوری غزلوں میں اور ہر شعر میں (جو منقبت کی جگہ شروع میں نہ لکھی گئی ہوں) اپنے عقیدے کا اظہار کرے اور "شیطان کے نطفہ الخ" جیسے سخت اور گندہ لہجہ میں اپنا مذہب دکھائے؟ اور خاصکر آتش جیسے بھولے بھالے۔ صوفی کے یہاں؟

کیا اب بھی ان اشعار کے الحاقی ہونے میں کسی کو کچھ شبہ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ کسی اور نے اس کی غزل کو ردیف "لام" میں اس لئے لکھا کہ اس پر آتش کی یا دوسروں کی نظر جلد نہ پڑے؟ پھر اگر یہ اشعار آتش کے ہوتے تو محمد حسین آزاد (جو مذہب کو مشتبہ کرنے کی فکر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور زمانہ والی پوچ روایات تک اسی مقصد سے گڑھتے ہیں) کیوں نہ تذکرہ آتش میں کوئی غزل یا کوئی شعر ایسا نقل کر دیتے؟ حالانکہ اس نے آبحیات میں تصریح کر دی ہے کہ آتش کے دو دواوین اس کی نظر سے گذرے ہیں۔ اگر اس کو یہ اشعار مل جاتے تو کیوں نہ وہ آتش کا مذہب صاف صاف شیعہ لکھ جاتا۔ حالانکہ آزاد وہی ہیں جنھوں نے غالب کو "منصور فرقہ اسد اللّٰہیان منم" سے فائدہ اٹھا کر ان کو نصیری کہا ہے اور خوب خوب مزے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آتش جیسے استاد کے ہاں زبان کی یہ غلطیاں بھی مل سکیں گی؟

(الف) پیروی پیشوا کی لازم ہے۔ روسیہ منکر امامت کا = دوسرے مصرعہ میں اس نے کہا ہے "منکر امامت کا روسیہ (ہو)" لیکن اس میں یا تو "کا" زائد ہے اس کی جگہ "ہے یا ہو" ہونا چاہیئے۔ اور با محاورہ میں ناجائز تصرف کیا ہے اس لئے کہ محاورہ یوں ہے۔ "اس کا منھ کالا" یا "اس کا رو سیاہ" لیکن "اس کا روسیہ" درست نہیں۔

(ب) دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو = اس میں "کو" حشو محض ہے۔

(ج) دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا = اس میں تعقید لفظی ہے اور مکروہ۔

بہرحال روز روشن کی طرح یہ بات نظر آ رہی ہے کہ یہ سب "آزاد کے کسی اہل راز" کی ایک ایجاد ہے۔ لیکن وہ اسکو بھول گیا کہ اس شدت و غلو، اس جوش و کثرت، اس لہجہ و طریقہ سے اور شبہ پیدا ہو جائے گا اور جب آتش جیسے بھولے بھالے

اور تصوف گو سادہ مزاج شخص کے منھ پر یہ اشعار نہ کھلیں گے تو پڑھنے والے صاف معلوم کرلیں گے کہ یہ جعلی الحاق ہے۔

یہاں تک تو جوابات تھے اُن شکوک کے جو پیدا کئے گئے یا پیدا کئے جاسکتے تھے۔ آتش کے تسنن کے بارہ میں۔ اب مختصراً اسکے وجوہ تسنن بیان کرتا ہوں:۔

(۱) آتش صوفی اور سنی باپ کا بیٹا تھا۔ خود تصوف گو تھا۔ سیدھا اور بھولا تھا اور مذہبوں کے جھگڑوں سے دور رہتا تھا۔ یہ اوصاف بجائے خود اُس کے شیعہ ہونے سے ابا کرتے ہیں۔

(۲) اُس زمانہ میں بادشاہ کے تشیع کا اثر رعایا پر بہت تھا۔ اور اکثر لوگ تبدیل مذہب کرکے شیعہ ہوجاتے تھے۔ مگر صرف وہی جن کو دربار میں رسائی کا شوق اور مال وجاہ کا لالچ تھا۔

چنانچہ شیخ امام بخش ناسخ کو یہ شرف نصیب ہوا کہ بقول آزاد پہلے مذہب سنت و جماعت رکھتے تھے پھر شیعہ ہو گئے ان کی زندگی تمام تر سیاسی چالوں میں گذری اور دنیا طلبی کے ذرائع ان کو اچھے حاصل تھے۔ لیکن آتش کو دربار سے تعلق اور امرا بادشاہ کے ہاں رسائی کا شوق نہ تھا۔ اس نے بادشاہ کا خلعت واپس کردیا۔ اور ایک رئیس شاگرد سے ملتے ہوئے روپے لوٹا دیئے۔ وہ متوکل قانع و عزلت گزیں تھا۔ ایسے شخص پر اس وقت کی آب وہوا کا اثر نہ پڑسکتا تھا نہ پڑا۔

(۳) کسی تذکرہ نویس نے آتش کو شیعہ نہیں لکھا یہاں تک کہ آزاد نے بھی نہ آتش کے تبدیل مذہب کا ذکر کیا نہ صاف طور سے اُس کو شیعہ لکھا۔ رہا اثر صاحب کا لکھنا تو اُنھوں نے یہ روش اختیار کی ہے کہ دوسرے لوگ جعلی روایات اور الحاق سے جو بنیادی اینٹ رکھ گئے تھے۔ اس پر پوری عمارت کھڑی کردی ہے۔ لیکن یہ نہ دیکھا کہ بنیاد ہی پانی پر تھی۔

(۴) آتش نے ایک دفعہ مرزا دبیر کے مرثیہ پر صاف کہدیا کہ "یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان"۔ اور ایک شیعہ مرثیہ جیسی مذہبی چیز پر ایسی سخت طنز نہیں کرسکتا۔

ہر چند کہ اس مضمون میں ابتک مرزا اثر صاحب کے مضمون پر استطراداً کچھ نقد وبحث آچکی ہے لیکن بعض اور باتیں بھی اُنکے مضمون میں ایسی ہیں جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیجاسکتیں۔

۱۔ مرزا صاحب غالباً بے خیالی میں ایک ایسی بات لکھ گئے ہیں۔ جس پر اطلاع ہونے کے بعد یقیناً اُن کو اس سے اختلاف ہوگا۔ اور وہ یہ کہ عام شعرائے لکھنؤ کا کلام تصوف سے خالی ہے۔ لیکن کیا اثر صاحب براہ کرم بتائیں گے کہ تصوف (جو جان تغزل۔ خمیر تغزل۔ بلکہ تمام تغزل ہوتا ہے اُس) کے لکھنؤ میں نہ ہونے کی کیا وجہ تھی یا ہوسکتی ہے؟ کیا اس کا جواب سوائے اس کے اور بھی کچھ ہوسکتا ہے کہ وہاں شیعیت کا زور تھا اس لئے تصوف کا چرچا نہ تھا یعنی سرزمین لکھنؤ، مفتی محمد عباس جیسی ہستیاں تو پیدا کرسکتی تھی جو یہ کہہ سکے کہ (اچہ کلام صوفیانِ شوم ہیئت الخ) لیکن خواجہ میر درد، میر سوز، مرزا مظہر، شاہ ولی شاہ حاتم، میر اور غالب اور آخر آخر میں آتش جیسے مقدس وجود نہ پیدا کرسکی۔

۲۔ مرزا صاحب نے آتش کے مضمون میں آب بقا سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ابتداء مضمون ہی میں حوالہ موجود ہے۔

لیکن خاص موقعوں پر وہ آزاد کی تقلید کر گئے ہیں۔ "فسانہ کیا" "بہانہ کیا" والے مشاعرے کے ذکر میں آب حیات نے لکھا تھا کہ نواب نے دوسرا خلعت آتش کو دے کر رخصت کیا۔ یہی مرزا صاحب بھی نقل کر گئے۔ حالانکہ آب بقا میں ہے کہ آتش نے خلعت لینے سے انکار کیا بلکہ اُسے بھی ناسخ ہی کو دلوا دیا اور خود شاہی گڑگڑی پر قناعت کی۔ آتش جیسا متوکل شخص اور وہ معرکۂ خاص کہ ناسخ نے "دشمنی، ہم چشمگی" برتی اور طرح کی اطلاع صرف ایک روز قبل آتش کو دی۔ اس صورت میں آتش کا خلعت قبول کر لینا۔ آتش کو کچھ اعلیٰ ثابت نہیں کرتا۔ بلکہ آب بقا کی روایت سے اس کی عالی ہمتی۔ سیر چشمی۔ اور صبر و توکل کا نہایت اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے۔ اگر اثر صاحب کوئی جامع اور مختتم مضمون لکھ رہے تھے تو یا تو اپنے ممدوح کی بابت عالی ہمتی کی روایت لکھتے۔ جس سے اس کی شخصیت بلند معلوم ہو۔ یا پھر اُصولاً دونوں روایتیں جمع کر دیتے۔ لیکن آخر یہ راز کیا ہے کہ کوئی مضمون تلاش و جستجو سے بھی لکھا جائے تو ایک مشہور و مسلم کذاب داستانہ گو مورخ کی تقلید تو کیجائے اور دوسرے مورخ کو یوں نذر تغافل کیا جائے گویا اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اگر آب بقا بروئے کار نہ آیا ہوتا یا اثر صاحب نے اس سے استفادہ نہ کیا ہوتا تو کچھ حرج نہ تھا۔ لیکن وضعداری اور آزاد پرستی کم سے کم اتنی تو ہو کہ آنکھ بند کر کے اس کو امام بنایا جاتا ہے۔

سلسلۂ سخن میں لکھنا پڑتا ہے کہ آب حیات ہر گز اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جا سکے۔ اس کی دروغ نویسی اس حد تک پہونچی ہوئی ہے کہ مرزا عسکری صاحب (مترجم تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ) کو دیباچہ ترجمہ تاریخ ادب اردو میں لکھنا پڑا کہ اُس نے افسانہ نویسی کی ہے۔ تاریخ نہیں لکھی۔ اس نے کہیں کہیں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اور یہ تنقیدیں جو برابر نکلتی آ رہی ہیں لازمہ اور خمیازہ ہیں۔ ان غلطیوں کا جو آزاد نے آبحیات میں کی ہیں۔

۳۔ مرزا صاحب نے اُستاد سے نزاع والی روایت بھی جس کی حقیقت آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ آبحیات سے نقل کر دی۔ تنقیدی نظر نہ ہونے کے علاوہ مرزا صاحب یہ بھی تو نہیں درج کرتے کہ اور تذکرہ نویسوں کے ہاں اس کا ذکر تک نہیں تاکہ پڑھنے والوں کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ آزاد اس روایت میں منفرد ہیں۔ پھر جو درجہ اُس کا قائم ہو سکتا وہ اپنے دل میں اس روایت کا قائم کرتے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مرزا صاحب کو آتش کے حالات میں تلاش و تحقیق یعنی ریسرچ کرنا نہیں تھا اور درایت و تنقید کی بجائے تقلید منظور تھی تو پھر مضمون کی ضرورت ہی کیا تھی؟

۴۔ مرزا صاحب نے بھی وہی آزاد کا سا یقین و اطمینان پیدا کر کے مذہب کی بابت لکھدیا کہ "شیعہ تھا" گویا یہ مسلم ہے اور اگر پوچھا جائے کہ حضور یہ دوٹوک فیصلہ کسی اور نے بھی کیا ہے جو آپ نے جلدی سے لکھ دیا؟ تو شاید جواب آسان نہ ہو۔ آزاد ہی کو دیکھئے، دیوان دیکھ چکا ہے مگر تشیع ریز اشعار نہیں لکھتا۔ اس کا دل خود چاہتا ہے کہ لکھنؤ کے دور تشیع کے ایک نامی شاعر کو شیعہ کر دکھائے مگر کوئی بات نہیں ملتی ناچار ایک پوچ روایت گڑھتا ہے اور زور پیدا کرنے کے لئے ایک دوسرے شخص کو اپنی مدد کے لئے بلاتا ہے کہ جو کچھ راست و دروغ ہو بر گردن راوی" مگر وہ بھی کم در ثابت ہو۔ پھر کوئی تذکرہ نویس اسکو شیعہ نہیں لکھتا یہ جناب

نے کیسے فیصلہ صادر کر دیا۔ کرسی عدالت پر بھی تو اتنی جلد حکم نہیں لگایا جاتا۔ اس سے بھی بڑھ کر بوالعجبی اور مرزا صاحب کی دلی پریشانی وہاں ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں یہ پُر لطف جملہ لکھا ہے "وہ ایک آزاد شاعر تھا اور باستثناء اُن حالتوں کے جب وہ کسی مذہبی عقیدے کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھول جاتا تھا کہ اُس کا مذہب کیا ہے"۔ واہ کیا خوب استثناء کیا ہے۔ آٹے سے بال نکالنا اسے کہتے ہیں لیکن اب بھی نتیجہ صاف یہی نظر آرہا ہے کہ مرزا صاحب پیش بندی کرنا اور ایک گنجائش نکالنا چاہتے ہیں اور جس طرح "آزاد" اور "اہلِ راز" کے پیدا کردہ شبہوں اور موقعوں سے مرزا صاحب نے فائدہ اُٹھایا ویسے ہی مرزا صاحب کی تحریر سے کسی دوسرے کو فائدہ اُٹھانے کا موقعہ ملے۔

۵۔ مرزا صاحب نے اپنے مضمون میں جہاں آتش کے اشعار کی تقسیم کی ہے۔ وہاں مسئلہ "رویت" کا عنوان قائم کرکے یہ تین شعر لکھے ہیں۔

(الف) بوئے گُل آتش کہیں ہوتی ہے محبوس نظر ؏ افترا ہے روزِ روشن یار کے دیدار کا۔

مرزا صاحب نے اس پر نوٹ لکھا ہے "دیدار اسکی معرفت دل سے ہے۔ آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں"۔ لیکن سخت تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے اس کو مسئلہ رویت کے عقیدے پر شاعر کی رائے سمجھا۔ حالانکہ صاف نظر آرہا ہے وہ مضمون آفرینی کے طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں تو اس کی معرفت دل سے یہیں حاصل ہے۔ پھر دیدار کا انحصار صرف روزِ محشر پر ہم کیوں مانیں۔ روزِ محشر پر دیدار کا انحصار ہمیں تو افترا معلوم ہوتا ہے۔

(ب) گرے گی برقِ جمال اس کی بند آنکھوں کو ؏ وہ خلوتی اگر اے انجمن نظر آیا۔

مرزا صاحب کا نوٹ اس پر یہ ہے کہ دیدار اس لئے بھی محال ہے کہ اُس نے یہ شعر کہا۔ افسوس ہے کہ مرزا صاحب نے اس کو تو عقیدہ رویت پر اظہارِ خیال سمجھا (حالانکہ اس میں محشر کا ذکر ہے نہ اس کا اشارہ حتی کہ انجمن سے بھی محشر مراد نہیں) لیکن آگے خود ہی (مقامِ حیرت) کے عنوان سے ایک شعر لکھا ہے۔ جو ٹھیک اسی مضمون ومفہوم کا ہے۔ اس سے عقیدہ رویت پر اظہارِ خیال نہیں سمجھتے۔ وہ شعر یہ ہے: "اُلٹا ادھر نقاب تو پردے پڑے اُدھر ؏ آنکھوں کو بند جلوہ دیدار نے کیا"۔

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ آنکھیں جلوہ دیکھنے کے بعد بند ہوں گی نہ کہ دیکھنے سے قبل۔ پس دیدار اور ایفائے وعدہ دیدار تو ہو گیا۔ رہا آنکھوں کا بند ہو جانا تو یہ اُس کے حسن کا کمال ہے اور اپنے ظرف کی کمی۔

(ج) اُٹھ چکا روزِ قیامت روئے قاتل سے نقاب ؏ روزِ محشر نگہ کے تیر کی منزل نہ ہو۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ رویت کا محال ہونا اس میں بھی دکھایا ہے۔ افسوس کہ اس شعر کے بارے میں ہمکو مرزا صاحب کے خیالات نہ معلوم ہو سکے کہ دوسرے مصرعہ کا مطلب اُنھوں نے کیا سمجھا ہے۔ اس لئے کچھ لکھنا ذرا بے موقعہ ہے۔

ان اشعار کے مطلب ومعنی کی طرح مختصراً اشارہ کیا جا چکا۔ لیکن مرزا صاحب کے اس جملہ نے "تصوف میں مسئلہ رویت مختلف فیہ ہے"۔ ہمکو بہت دیر تک غرقِ حیرت رکھا۔

مرزا صاحب نے "تصوف میں رویت کا انکار" کہیں سے سُن لیا ہوگا۔ اس لئے اس استدلال سے کام لیا بندہ نواز، صوفیوں کے ہاں نفس رویت خداوندی سے انکار نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ صوفی جو خدا کا طالب ہوتا ہے۔ کس منھ سے دیدار محبوب کا انکار کرے گا؟ بلکہ اختلاف اس امر میں ہے کہ یہاں اس دنیا میں اس جسم خاکی کے ساتھ اُن آنکھوں سے بھی دیدار ہو سکے گا یا نہیں؟ اس میں بعض قائل ہیں۔ ہو سکتا ہے اور بعض منکر۔ یہی اختلاف اسلام کے بعض فرق ظاہرہ میں بھی ہے اور معتزلہ نے اس سے صاف انکار کیا ہے (عقائد نسفی میں اسکی پوری بحث موجود ہے)

ایک صوفی کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔" ؎ بقرآں ہم نیا وردہ است ایماں زاہد اعمیٰ ۶ اگر دیدار اینجا نیست آخر جلوہ گاہ کو"؟ لیکن اس میں رویت کا جو پہلو بیان ہوا ہے۔ ظاہر ہے۔ لیجئیے یہ تھا مطلب رویت سے اختلاف کا جسے جناب اثر صاحب جیسے اہل قلم نے واقف کارانہ انداز میں اس شدومد سے لکھا ہے۔

سراج الحق مچھلی شہری